راہِ معرفت (5)

راہِ معرفت

- صحیح امتیاز اور غلط امتیاز
- مشکلات و مصائب کی اصلیت

المہدیؑ ادارہ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

شہید مطہری اپنی پوری عمر اسلامِ عزیز کے مقدس اہداف کے حصول کی جدو جہد میں مصروف رہے، بے راہ رویوں اور انحرافات کے خلاف جانفشانی سے نبرد آزما ہوئے، شہید مطہری دین اسلام اور اس کے مختلف علوم میں تبحر اور قرآن حکیم کے حقائق و غوامض کی بصیرت و معرفت میں اپنی مثال آپ تھے، شہید مطہری میری عمر کا حاصل تھے۔

امام خمینیؒ

شہید مطہری انقلاب اسلامی کا فکری ستون ہیں اور انقلاب کی کامیابی بلکہ اس کو وجود میں لانے میں شہید مطہری کا بہت بڑا کردار رہا ہے اگر آج بھی آپ اسلام کے ترجمان بننا چاہیں اور دینی معارف کو سمجھنا چاہیں تو لازمی ہے کہ کم از کم ایک بار اُستاد مطہری کے تمام آثار اور کتب کا مطالعہ کریں۔

رہبر معظم سید علی خامنہ ای حفظہ اللہ

المہدیؑ ادارہ تربیت اسلامی
آئی ایس او پاکستان

راہ معرفت (۵)

۱۔ صحیح امتیاز اور غلط امتیاز

اہداف:

۱۔ عدل کی صحیح تعریف کیا ہے؟

۲۔ انسان کے مدنی الطبع ہونے کا کیا مطلب ہے؟

۳۔ حقیقی مساوات سے کیا مراد ہے؟

میں اس جلسہ میں عدل ومساوات کے معنی کی تشریح کرنا اور یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کس طرح کی اونچ نیچ اور فرق و امتیاز ہے جو انصاف کے منافی ہے۔ کیا ہر تفاوت جو مختلف افراد کے درمیان کسی معاشرے میں پائی جائے، انصاف کے منافی ہے؟ کیا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کسی فرد کو کسی دوسرے پر کوئی امتیاز حاصل نہ ہو، یا انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی بیجا اور نا مناسب امتیاز حاصل نہ ہو؟ اگر دوسری شق مقصود ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیجا اور بجا، مناسب اور نا مناسب کا معیار کیا ہے؟ تفاوت اور امتیاز کس بنیاد پر ہو، تو اسے بجا اور جائز سمجھا جائے گا اور کس بنیاد پر ہو تو اسے بیجا اور ناجائز سمجھا جائے گا۔

امام علی کی نظر میں عدل کی تعریف:

میں نے پچھلے جلسہ میں امام علیؑ کا وہ جواب نقل کیا تھا جو آپ نے عدل و وجود کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ جود و بخشش بہتر ہے یا عدل و انصاف؟ امام کا جواب یہ تھا کہ عدل بہتر ہے۔ آپ نے اس کی دو دلیلیں دی تھیں۔ ایک دلیل یہ تھی کہ عدل ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھتا ہے اور جود و بخشش سے چیزیں اپنے جگہ سے ہٹ جاتی ہیں۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ عدل اس لیے بہتر ہے کہ اس سے سب لوگ ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان میں کوئی فرق و امتیاز باقی نہیں رہتا بلکہ یہ فرمایا تھا کہ عدل اس لیے بہتر ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنی صحیح جگہ پر رکھتا ہے۔

عدل و وجود کے بارے میں امام کے جواب کی بنیاد اس قاعدے پر ہے کہ انصاف کا تقاضا یہ نہیں کہ افراد کے درمیان ہر قسم کا تفاوت ختم کر دیا جائے۔ بلکہ اس پر ہے کہ جس کا جو حق ہے اس کو ضرور ملے۔ یہاں جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا، دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ استحقاق اور عدم استحقاق اور بجا اور بیجا ہونے کا معیار کیا ہے؟

معاشرہ ایک زندہ جسم کی مانند ہے:

پہلے کچھ تمہید عرض کرتا ہوں، بعد میں اس سوال کا جواب دوں گا۔ معاشرے کی اس سے بہتر تشبیہ نہیں ہو سکتی کہ اسے زندہ جسم کہا جائے۔ جس طرح جسم اعضاء و جوارح کا مرکب ہے اور اس میں ہر عضو اپنا مخصوص کام کرتا ہے اسی طرح معاشرہ تشکیل پاتا ہے اور جن جن کاموں کی معاشرے کو ضرورت ہوتی

ہے وہ مختلف افراد اور برادریوں کے درمیان پیشوں کی شکل میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ جسم کے اعضا میں ہر ایک کا اپنا مقام اور درجہ ہوتا ہے۔ کوئی حکم دیتا ہے کوئی قبول کرتا ہے۔ کسی کا درجہ کم ہوتا ہے اور کسی کا زیادہ۔ اسی طرح ہر معاشرے میں چاہے اس کا انتظامی ڈھانچہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اور معاشرے میں کوئی بھی نظام حکومت کارفرما کیوں نہ ہو تقسیم کار کا ہونا ضروری اور لابدی ہے۔ علیحدہ علیحدہ پیشے اور عہدے ہونا لازمی ہیں۔ ایک طرح کی درجہ بندی ضروری ہے۔ ایک شخص سوچ کر منصوبہ بناتا ہے اور دوسرا اسے عملی جامعہ پہناتا ہے۔ ایک حکم دیتا ہے دوسرا اس کی تکمیل کرتا ہے۔ ایک اعلی منصب پر فائز ہوتا ہے دوسرا ادنی عہدے پر۔ معاشرے میں کوئی بھی نظام نافذ ہے، اس کی اپنی مخصوص تنظیم کا ہونا لازمی ہے

جس طرح جسم تندرست اور بیمار ہوتا ہے اسی طرح معاشرہ بھی تندرست اور بیمار ہوتا ہے۔ جسم پیدا ہوتا ہے نشونما پاتا ہے، پھر اس کی انحطاط شروع ہو جاتی ہے اور آخر موت واقع ہو جاتی ہے یہی حال معاشرے کا ہے۔ جسم اگر صحت مند ہو تو سب اعضاء مل جل کر کام کرتے ہیں۔ معاشرہ بھی اگر صحت مند اور زندہ ہو اور اس میں اجتماعی روح موجود ہو تو پھر اس کی یہی صورت حال ہے معاشرے کو جسم سے خود رسول اکرمؐ نے تشبیہ دی ہے۔ آنحضرت نے فرمایا:

مومنین میں جو آپس میں محبت و ہمدردی ہے اس کے لحاظ سے ان کی مثال ایک جسم کی سی ہے۔ جب جسم کے کسی حصہ میں تکلیف ہوتی ہے تو سب اعضاء ایک دوسرے کو اس کی اطلاع دیتے ہیں اور بخار اور بے خوابی کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔

شیخ سعدی نے اپنے مشہور اشعار مین اس حدیث کا ترجمہ یوں کیا ہے

بنی آدم اعضاء یک پیکرند
که در آفرنیش زیک گوهرند
چو عضوے بدرو آورد روزگار
دگر عضو هارا نماند قرار

جسم اور معاشرے میں اور بھی کئی باتوں میں مشابہت ہے ۔

عام طور پر جب کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے تو ان میں ایک یا دو باتوں میں

مشابہت ہوتی ہے لیکن جسم اور معاشرے میں اس سے زیادہ وجوہ مشابہت موجود ہے ۔ جسم اور معاشرے میں دس سے زیادہ وجوہ مشابہت ہیں اور شاید اور بھی زیادہ ہوں اس لحاظ سے یہ اپنی نظیر آپ ہے

گو یا تشبیہ بڑی جامع ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جسم اور معاشرے میں ہر لحاظ سے مماثلت ہے۔ کئی لحاظ سے جسم اور معاشرے میں بھی فرق ہے۔ عدل و انصاف کا مطلب واضح کرنے کے خیال سے آج اس فرق کے کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں۔

زندہ جسم اور معاشرے کا فرق:

ایک فرق یہ ہے کہ جسم میں ہر عضو کا مقام معلوم اور متعین ہے۔ نہ کسی عضو کی جگہ بدلتی اور نہ اس کا کام۔ مگر معاشرہ جن افراد سے تشکیل پاتا ہے ان کی یہ صورت نہیں ہے۔ آنکھ، ناک، کان، ہاتھ پاوں ہر ایک کا ایک معین مقام اور مخصوص کام ہے۔ آنکھ ہمیشہ آنکھ اور کان ہمیشہ کان ہی رہتا ہے۔ آنکھ کا کام ہمیشہ دیکھنا اور کان کا کام ہمیشہ سننا ہے۔ اسی طرح پاوں ہمیشہ پاوں اور ہاتھ ہمیشہ ہاتھ ہی رہتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہاتھ اپنی قابلیت کی بنا پر پاوں کی جگہ لے لے یا پاوں ہاتھ بن جائے۔ یہی حال سب اعضا و جوارح کا ہے۔ دل، دماغ، پھیپھڑا، جگر معدہ آنتیں سب کا ایک نا قابل تغیر مقام ہے۔ اور ہر ایک کو ایک خاص کام کے لیے بنایا گیا ہے اور وہ اس کام کے علاوہ کوئی دوسرا کام انجام نہیں دے سکتا۔ کیا ہر فرد اور ہر گروہ کا معاشرے میں رہنا ایک اور فقط ایک مخصوص مقام ہے۔

اب دیکھیے معاشرے کے افراد کی کیا صورت ہے؟ کیا یہ بھی اعضاء و جوارح کی طرح ہیں؟ ہر فرد اور ہر گروہ فقط ایک ہی کام کے لیے بنا ہے اور اس کام کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کر سکتا۔ جس آنکھ، کان، جگر، دل کا کام معین اور معلوم ہے، کیا افراد اور مختلف ذاتوں اور برادریوں کا کام بھی مقرر ہے۔ ایک ذات کے لوگ وہی کا کام کرنے پر مجبور ہیں جو اس ذات کے لیے مخصوص ہے۔ کوئی دوسرا کام یا پیشہ اختیار نہیں کر سکتے۔ یا یہ بات نہیں ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ صورت نہیں۔ اعضاء و جوارح خود کوئی عقل نہیں رکھتے، نہ اپنے ارادے سے ان میں انتخاب اور اختیار کا سلیقہ ہے۔ وہ اس روح کے تابع ہیں جو پورے جسم پر حکم فرما ہو۔ وہ **لا یعصون اللہ**

ما اھدھم کا مکمل مصداق ہیں لیکن معاشرے میں افراد کی یہ صورت نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ معاشرہ بھی ذی حیات ہے۔ اس کی بھی روح لیکن اس روح اجتماعی کو اپنے افراد پر اس درجہ قابو اور تسلط حاصل نہیں ہے۔

انسان کے مدنی الطبع ہونے کا مطلب:

بہت زمانے سے حکما کہتے آئے ہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی وہ فطرتاً سوشل ہے۔ بعد میں آنے والے فلاسفہ نے اس فقرہ کا مزید تجزیہ یہ دیکھنے کے لیے کیا کہ انسان کے فطری طور پر مدنی الطبع ہونے کا کیا مطلب ہے اگر یہ مطلب ہے کہ انسان اور نباتات وحیوانات البتہ بعض حیوانات میں فرق یہ ہے کہ انسان میں جو فطری استعداد موجود ہے اور جن کمالات کو حاصل کرنے کی انسان سے امید کی جاسکتی ہے ان کا فروغ معاشرتی زندگی میں میسر آ سکتا ہے۔ اور انسانی زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے متمدن زندگی کا ہونا ضروری ہے جب تو یہ بات درست ہے لیکن اگر مطلب یہ ہو کہ قدرتی طور پر انسان معاشرتی زندگی اختیا کرنے پر مجبور ہے اور وہ اس کا فطری تقاضا ہے جس میں اس کے اختیار اور انتخاب کو دخل نہیں جیسا کہ شہد کی مکھی، دیمک اور چیونٹی جیسے بعض جانوروں کے ساتھ یہی صورت حال ہے جن کی فطری ساخت ہی یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ مل جل کر رہیں۔ ان کے افراد اجتماعی زندگی بسر کریں اور اپنا مخصوص کام اس طرح سرانجام دیتے رہیں جس طرح مختلف جسمانی اعضا انجام دیتے ہیں تو انسان کے مدنی الطبع ہونے کا یہ مطلب صحیح نہیں ہے انسان کی معاشرتی زندگی اس طرح کی نہیں۔ یہ البتہ درست ہے کہ انسان معاشرے سے الگ تھلگ رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ علاوہ ازیں انسان میں کچھ ایسی پوشیدہ صلاحیتیں بھی موجود ہیں جو اجتماعی زندگی کے بغیر بروئے کار نہیں آسکتیں اور کچھ ایسی ضرورتیں ہیں جو اجتماعی زندگی کے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں۔

یہ ضرورتیں اور صلاحتیں انسانی خلقت کا ایک حصہ ہیں اور یہی ضرورتیں اور صلاحیتیں انسان کو اجتماعی زندگی گزارنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ لیکن یہ بات انسان کا نسبتاً صاحب عقل وارادہ ذی اختیار ہونے کے منافی نہیں۔ انسان نے اجتماعی زندگی کو خود اپنی عقل کے مطابق اور اپنے ارادے سے اختیار کیا ہے۔

معاشرے میں اور جسم میں کمال مشابہت کے باوجود یہ فرق ہے کہ جسم کے ہر عضو کا مقام متعین اور معلوم ہے اور اس کا کام بھی مقرر ہے لیکن معاشرے کے افراد کی یہ صورت نہیں۔ جسم کے اعضاء وہی

کچھ ہو سکتے ہیں جو کچھ وہ ہیں، لیکن معاشرے کے افراد محنت و قابلیت سے کچھ بھی بن سکتے ہیں۔ معاشرے کے افراد کے لیے قدرتی اور فطری طور پہ مقرر نہیں کہ ان کا کیا مقام اور کیا درجہ ہے اور وہ معاشرے میں کس نوعیت کی خدمات سرانجام دیں گے اور کیا پیشہ اختیار کریں گے۔ فرد کا معاشرے میں کام مقرر نہیں اس کے لیے عمل کا میدان وسیع اور کھلا ہوا ہے۔ ہر فرد اپنی لیاقت اور قابلیت کے مطابق اپنے کام اور پیشے کا آزادی سے انتخاب کرسکتا ہے۔ اس لیے اس کے مقام پیشے اور عہدے میں ردوبدل ہوسکتی ہے۔ کسی کی پیشانی پر لکھا ہوا نہیں ہے کہ وہ لازماً یہ کام اور پیشہ اختیار کرے گا اور فلاں دوسرا شخص وہ دوسرا کام جس طرح آنکھ، کان، زبان، ہاتھ کا کام مقرر ہے اسی طرح یہ مقرر نہیں کہ معلم کون ہوگا، معمار کون ہوگا بڑھئی کون ہوگا، تاجر کون ہوگا، کسان کون ہوگا، داکٹر کون ہوگا، الیکٹریکل انجینئر کون ہوگا اور سول انجینئر کون ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ جسم کے اعضا میں کام کی تقسیم اور درجہ بندی قدرتی ہے اور فطری طور پر ہر ایک کی جگہ مقرر ہے لیکن یہ کام معاشرے میں انسان کے ہاتھوں خود انجام پاتے ہیں۔ لوگ خود اپنا کام تقسیم کرتے اور اپنی درجہ بندی کرتے ہیں۔ میدان عمل سب کے لیے کھلا ہے۔ سب انسان ہیں۔ سب عقل رکھتے ہیں۔ سب ارادی واختیاری ہیں، سب کی اپنی اپنی شخصیت ہے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ تقسیم کار کی صورت کیا ہونی چاہیے؟ درجہ بندی جس میں ادنی واعلی اور پست وبالا کا ہونا لازمی ہے، کس بنیاد پر ہو؟ معاشرے میں افراد کو مقرر کرنے کا معیار کیا ہو؟ کیا یہ سب باتیں طے کرنے کے لیے قرعہ اندازی ہونی چاہیے؟

طریقہ ایک ہی ہے کہ کسی پر زبردستی نہ کی جائے۔ سب کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ زندگی مقابلے کا میدان ہو اور ہر شخص کو مقابلہ میں شرکت کا حق ہو۔ پھر ہر شخص اپنے ذوق اور استعداد کی مناسبت سے اور اپنی لیاقت اور محنت کے مطابق پیشہ اور کام اختیار کرے اور اپنا مقام پیدا کرے۔

تنازع للبقاء:

بعض لوگ زندگی کو میدان جنگ سے تشبیہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زندگی تنازع للبقا سے عبارت ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جہد للبقا کہا جائے کیونکہ تنازع میں لڑائی جھگڑے کا مفہوم شامل ہے۔ گو بعض

لوگوں کے نزدیک زندگی کا مطلب ہی جنگ وجدال ہے۔ان کے خیال میں انسانی زندگی میں سب سے بڑا اصول جو کارفرما وہ مخاصمت اور دشمنی ہے۔تعاون اور صلح جوئی تو جھگڑوں کے نتیجہ میں زبردستی انسان پر مسلط کیے جاتے ہیں۔اس وقت اس نکتہ پر بحث کا موقع نہیں۔اجمالا اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ دراصل یہ بات صحیح نہیں ہے۔لڑائی جھگڑا انسان کی فطرت کا لازمی جزو نہیں، البتہ زندگی میں مقابلہ فطری چیز ہے۔ زندگی اگر اپنے صحیح محور پر ہو تو اس میں بقا کے لیے مقابلہ ضروری ہے لیکن زندگی کی دوڑ میں مقابلہ کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ایک تو فرد کو آزادی دوسرے معاشرے میں نظم وضبط تاکہ بدنظمی اور ابتری نہ پھیلنے پائے۔

اس مقابلہ کی مزید وضاحت ضروری ہے۔کسی جسمانی مقابلہ کا خیال کیجیے۔مثلاً کشتی کا مقابلہ، دوڑ کا مقابلہ یا وزن اٹھانے کا مقابلہ۔ان مقابلوں میں تمغے ملتے ہیں۔انعام ملتا ہے، عزت اور مقبولیت ملتی ہے۔یہ انعام کس کو ملتا ہے جس کی مقابلے میں کارکردگی بہتر ہو۔پیدائش کے دن سے کسی کے ماتھے پر لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ اس کو وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے ہونے کا حق ہے اور کسی اور کو حق نہیں ہے بلکہ مقابلے میں سب کو شرکت کا حق ہے۔شرکت کی آزادی ہے۔ان میں ہی سے کچھ اپنی مشق اور محنت کی وجہ سے انعام کے مستحق قرار پاتے ہیں اور کچھ یا تو فطری عدم صلاحیت کے باعث یا مشق اور محنت کی کمی کی وجہ سے انعام سے محروم رہتے ہیں۔یہی حال کسی جماعت کے طلبہ کا ہے۔وہ سال بھر تک کلاس میں حاضر ہوتے ہیں۔سبق پڑھتے ہیں۔سال ختم ہونے پر ان کا امتحان لیا جاتا ہے۔ان کو نمبر دیے جاتے ہیں کوئی پاس ہوتا ہے اور کوئی فیل۔کوئی اول آتا ہے اور کوئی امتیازی نمبر حاصل کرتا ہے۔باقی کو ان کی استعداد اور محنت کے مطابق نمبر ملتے ہیں۔

چونکہ معاشرے اور جسم میں فرق ہے اس لیے معاشرے کے افراد کے فرائض منصبی تخلیقی نظام کے تحت معین نہیں کیے گئے ہیں۔اللہ تعالی نے انسان کو آزاد اور خودمختار پیدا کیا ہے لہٰذا اس کا کام مقام اور اس کی حیثیت اس طرح مقرر نہیں کی ہے اس میں کوئی ردوبدل نہ ہو سکے بلکہ اس کو عمل کے لیے وسیع میدان دیا ہے۔ان تمام امور کی بنا پر معاشرہ ایک طرح سے مقابلہ کا میدان ہے۔افراد یہ مقابلہ جیت کر اور اپنی لیاقت، استعداد اور کارکردگی کا مظاہرہ کر کے دنیا کی مختلف نعمتیں اور حقوق حاصل کرتے ہیں۔میں یہ نہیں کہتا کہ سب لوگ اپنے ذوق اور استعداد کے لحاظ سے برابر ہیں اور سب ایک طرح سے کام

کرتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس لحاظ سے ہر شخص کی استعداد مختلف ہے۔ہر ایک کا اپنا ذوق ہے اس لیے ہر شخص کو کسی کام میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اور کسی کام میں کم لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ کوئی شروع ہی سے یہ سمجھ لے کہ وہ ایک خاص کام کے لیے بنایا گیا ہے یا جس طرح جسمانی اعضا کی جگہ مقرر ہے اسی طرح معاشرے میں اس کی جگہ مقرر ہے۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ معاشرے میں مقابلے کا میدان ان تمام معاملات میں کھلا رہے۔اور سب کو اس مقابلے میں شرکت کا مساوی موقع دیا جائے اور معاشرہ ایسا منظم اور اس کا انتظام اتنا عمدہ ہو کہ صرف وہی لوگ معاشرے میں آگے آسکیں جو ان مقابلوں میں اپنی اہلیت اور قابلیت ثابت کر دیں۔

مقابلے کے دو خاص جزو:

مقابلہ دو چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے ایک تو وہ کام جن میں مقابلہ ہوتا ہے، جیسے دوڑ، کشتی یا وزن اٹھانا۔دوسرے وہ انعام اور عزت جو مقابلہ جیتنے والے کو ملتی ہے۔معاشرہ بھی چونکہ مقابلے کا میدان ہے اس لیے اس میں بھی دو پہلو موجود ہیں۔ایک تو وہ کام جس میں مقابلہ ہو اور دوسرے وہ حق اور حصہ جو اس کے نتیجہ میں کچھ لوگوں کو ملے۔اب سوال یہ ہے کہ مقابلہ کس چیز میں ہونا چاہیے اور اس کا انعام کیا ہونا چاہیے۔اس پر اگر تھوڑا سا غور کر لیا جائے تو مطلب حل ہو جاتا ہے۔مقابلے کے کام تو وہی ہیں جو انسان کے لیے مفید ہیں اور جن سے انسان کی سماجی زندگی وابستہ ہے۔

مقابلہ ان کاموں میں ہونا چاہیے جن سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو۔علم وفضل میں مقابلہ ہونا چاہیے، نیکی اور تقوی میں مقابلہ ہونا چاہیے۔عقل وسمجھ اور فہم وفراست میں مقابلہ ہونا چاہیے سعی وعمل میں مقابلہ ہونا چاہیے۔پیداواری کاموں اور خدمت میں مقابلہ ہونا چاہیے۔ان مقابلوں میں کامیاب ہونے والوں کا انعام ان کے وہ حقوق ہیں جن کے وہ اپنے کام، صلاحیت ولیاقت اور محنت کے مطابق مستحق قرار پائیں۔اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ افراد کے حقوق بمنزلہ اس انعام کے ہیں جو مقابلوں میں شرکت کرنے والوں کو دیے جاتے ہیں۔یہ گویا کہ وہ نمبر ہیں جو طلبہ کو امتحان کے بعد دیے جاتے ہیں اور یہ بھی سمجھ لیں کہ مقابلہ صرف ان کاموں میں ہوتا ہے جن کو مذہب نے خیر اور عمل صالح قرار دیا ہے۔اگر ہم ان دو باتوں کو سمجھ لیں تو ہماری سمجھ میں اچھی طرح آجائے گا کہ کس کو انعام اور نمبر دیں اور کس کو نہ دیں۔کس کو

زیادہ دیں اور کس کو کم۔

میں نے پچھلے جلسوں میں کہا تھا کہ اسلام میں حق اور فرض کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ یہ مقابلہ وہی حق اور فرض کا مقابلہ ہے۔ حقوق دراصل وہ نمبر ہیں جو فرض کے میدان میں مقابلہ کرنے والوں کو ملنا چاہئیں۔

اسلام میں حق اور فرض کا جو ساتھ ہے اگر ہم اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیں، یہ سمجھ لیں کہ جب ہم کہتے ہیں کہ زندگی ایک مقابلہ اور ایک دوڑ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی فرائض کی ادائیگی کا مقابلہ ہے بفحوائے، **و ان لیس للانسان الا ماسعیٰ**۔

آدمی کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے ہم یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیں کہ زندگی کے مقابلے کا نتیجہ اور انعام سماجی حقوق سے بہرہ مند ہونا ہے۔ اگر ہم یہ ساری باتیں بخوبی سمجھ لیں تو گویا ہم نے اسلام میں سماجی حقوق کا سب سے بڑا بنیادی اصول سمجھ لیا، یہ بنیادی الفاظ تمام معاملات میں ایک روشن چراغ کی طرح ہماری رہنمائی کرے گا اور یہ ہمیں اندھیروں میں بھٹکنے نہیں دے گا۔

عدل یا مساوات:

یہاں سے عدل کے معنی معلوم ہوجاتے ہیں اور اس کا سوال جواب مل جاتا ہے جو میں نے شروع میں اٹھایا تھا۔ سوال یہ تھا کہ انصاف کا کیا مطلب ہے اور اس کا بالمقابل فرق و امتیاز اور تفاوت کا کیا مطلب ہے۔ آیا ہر قسم کا تفاوت جو معاشرے میں پایا جاتا ہے، انصاف کے منافی ہے؟ کیا عدل کا مطلب مکمل مساوات ہے؟ یا عدل کا مطلب مکمل مساوات نہیں بلکہ بعض صورتوں میں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ امتیاز اور تفاوت باقی رہے۔ انصاف کا تقاضا صرف یہ ہے کہ فرق و امتیاز بیجا اور بلا استحقاق نہ ہو۔ اس دوسری صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بجا اور بیجا کا معیار کیا ہے؟

یہ تو معلوم ہے گیا کہ انصاف کے یہ معنی نہیں کہ سب کا ایک ہی مقام اور ایک ہی درجہ ہو۔ معاشرے میں مختلف مقامات اور مختلف درجات کا ہونا لازمی ہے۔ اس معاملے میں بھی انسانی معاشرے کی مثال انسانی جسم کی سی ہے۔ جب مقامات اور درجات میں تفاوت ہوا تو درجہ بندی بھی ضروری ہوگئی۔ اس کی واحد صورت یہ ہے کہ افراد کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور مقابلے کے لیے راہ ہموار کردی جائے۔ چونکہ سب

کی استعداد یکساں نہیں اور نہ سب برابر محنت اور کوشش کرتے ہیں اس لیے خود بخود فرق اور تفاوت پیدا ہوجائے گا۔ کوئی آگے نکل جائے گا، کوئی پیچھے رہ جائے گا۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جو فرق معاشرے میں ناگزیر ہے وہ استعداد اور لیاقت کے تابع ہو۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ امتحان میں جتنے طلبا شرکت کریں، ان میں ہر ایک کو اتنے ہی نمبر دیے جائیں جتنے نمبروں کا وہ مستحق ہے۔ یہ کوئی انصاف نہیں کہ کہ سب کو برابر نمبر دے دیئے جائیں اور یہ کہا جائے کہ اگر برابر نمبر نہ دیئے گئے تو یہ امتیاز ہوگا جو ظلم ہے بلکہ اصل تو یہ ہے کہ اگر سب کو برابر نمبر دیے گئے تو اس صورت میں حق دار کا حق مارا جائے گا۔ یہی دراصل ظلم ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ چمپین شپ کے مقابلوں میں ہارنے اور جیتنے کا معیار لیاقت، کوشش اور اپنے فن کی نمائش ہو۔ یہ انصاف کا تقاضا نہیں کہ ماہر فن اور اناڑی کو ایک آنکھ سے دیکھا جائے اور لائق نالائق میں کوئی فرق روا نہ رکھا جائے اس طرح کی مساوات تو عین ظلم اور بے انصافی ہے البتہ جس فرق کی بنیاد قابلیت اور کارکردگی پر ہو وہ عین انصاف ہے۔ انصاف کا تقاضا مساوات ضرور ہے لیکن صرف یکساں قانونی حالت میں یعنی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو لوگ کسی علمی یا جسمانی مقابلے میں شرکت کریں، ان کے مابین ان امور کے علاوہ جن کا تعلق استعداد، ہنر اور لیاقت سے ہے کسی اور بنیاد پر فرق کیا جائے۔ مثلاً اس بنیاد پر کہ ایک گورا ہے، دوسرا کالا یا فرض کرو ایک نوابزادہ ہے دوسرا کسی غریب کا بیٹا۔ ایک کے پاس سفارش ہے دوسرے کے پاس نہیں۔ ایک کے حامیوں کا جتھا ہے، دوسرے کا کوئی مددگار نہیں۔ ایک کی استاد یا ریفری سے رشتہ داری ہے یا برادری کا تعلق ہے، دوسرے کا نہیں۔ یہ ہیں وہ باتیں جن کو کامیابی یا ناکامی میں دخل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ وہ امور ہیں جن کا تعلق قابلیت، استعداد اور کارگزاری اور کوشش سے نہیں ہے۔ اگر قابلیت اور استعداد کا لحاظ رکھے بغیر سب کو مساوی نمبر دے دیے جائیں اور کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے تو یہ بھی ظلم ہوگا اور اگر فرق تو کیا جائے لیکن فرق کا معیار اس قسم کی باتوں کو بنایا جائے تو یہ بھی ظلم ہوگا۔

العدالۃ اعطاء کل ذی حقٍ حقہ

یہ فرق ہے، بجا اور بیجا تفاوت میں اور روا اور ناروا امتیاز میں، اور یہی معنی ہیں اس فقرہ کے کہ:

یعنی انصاف یہ ہے کہ ہر حقدار کو اس کا حق دیا جائے اور یہی مطلب ہے امیر المومنینؑ کے اس قول کا جس میں آپ نے فرمایا:

العدل یصنع الامور مواضعها

عدل ہر چیز کو اپنی صحیح جگہ پر رکھتا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ عدل سب کو ایک ہی درجہ اور مرتبہ میں رکھتا ہے اور سب کو بلا امتیاز ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ اجتماعی امور میں سماجی حقوق اور سماجی فوائد حاصل کرنے کے ایک مکمل مقابلہ کرنے کی صورت پیدا کی جائے اور اس پر عمل ہو، مساوات اور سب کو ایک آنکھ دیکھنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ کام میں ذاتیات کا سوال قطعاً نہ ہو۔ شخصی اور طبقاتی فرق کا لحاظ نہ کیا جائے اور سب کو برابر سمجھا جائے۔ نبی اکرم نے فرمایا:

الناس کاسنان المُشط

لوگوں کی مثال کنگھی کے دندانوں کی سی ہے یعنی سب برابر ہیں یا آپ نے فرمایا:

ربکم واحد وان اباکم واحد کلکم من اٰدم واٰدم من تراب

تمہارا پروردگار ایک ہے تم ایک ہی باپ کی اولاد ہو۔ تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔

یعنی کسی طرح کا شخصی امتیاز، فرق اور برتری ایسی نہیں ہونی چاہیے، جس کی بنیاد علم و فضل، تقوی و طہارت اور عمل و لیاقت پر نہ ہو۔ اس لیے آپ نے اس جملہ کا بھی اضافہ فرمایا

قرآن مجید رنگ و خون اور نسل و جنس کے تمام امتیازات کو لغو قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا

ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیے اور پہچان کے لیے قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے فورا بعد کہا گیا ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقٰكُمْ (حجرات:13)

بے شک خدا کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ باتقویٰ ہے۔

یہاں تقوی پر مبنی امتیاز کا باضابطہ اعتراف کیا گیا ہے۔

قرآن کہتا ہے عالم و جاہل اور متقی و غیر متقی ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ (ص:28)

کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اہل ایمان اور نیک کام کرنے والوں کو زمین میں فساد پھیلانے والوں کو برابر کر دیں اور اہل تقوی کو بدکرداروں کے برابر کا درجہ دے دیں۔

اس طرح اللہ تعالی فرماتا ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ (الزمر:9)

کہہ دیجیے کہ کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟ سمجھدار لوگ ہی یہ بات سمجھتے ہیں کہ برابر نہیں ہو سکتے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالی فرماتا ہے:

وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا (النساء:95)

گھر میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے مقابلے میں اللہ نے جہاد کرنے والوں کو اپنے فضل سے بڑا اجر دیا ہے۔

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا (زخرف:32)

کیا وہ لوگ آپ کے پروردگار کی رحمت کو تقسیم کرتے ہیں؟ یہ تو ہم نے دنیا جہان کی نعمتیں ان لوگوں میں اس دنیاوی زندگی میں تقسیم کی ہیں اور ان میں سے کچھ بعض دوسروں سے بڑھ کر بنایا ہے اور یہی فرق اس کا باعث ہو کہ لوگ ایک دوسرے سے کام لے سکیں اور زندگی کا سماجی نظام استوار ہو سکے۔

اہلیت کے لحاظ سے افراد میں فرق:

افراد کی صلاحیت میں قدرتی فرق تخلیق کا شاہکار ہے خصوصا اگر یہ بات نظر میں رکھی جائے کہ کہ اگر کسی ایک کو ایک لحاظ سے امتیاز اور تفوق حاصل ہے تو کسی دوسرے کو کسی دوسرے لحاظ سے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سب ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور سب کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔

دنیا کے ترقی یافتہ معاشروں کی کوشش یہ ہے کہ عدل ومساوات کا قیام ہو۔اس کام میں ان کو جتنی بھی کامیابی ہوئی ہے،اس کی یہ صورت نہیں ہے کہ اہل اور نااہل، ہوشیار اور احمق، مستعد اور کاہل، ہونہار اور اناڑی، دیانتدار اور بددیانت، خدمت گزار اور خائن میں عدل اور مساوات کے نام پر امتیاز نہ کیا جائے۔ان مین امتیاز نہ کرنا انصاف نہیں بلکہ ظلم ہوگا۔

حقیقی مساوات:

مساوات یہ ہے کہ سب کو مساوی مواقع فراہم کیے جائیں۔ترقی کا میدان بطور یکساں کھلا ہوا ہو۔راہ سب کے لیے ہموار ہوتا کہ اگر کوئی ہمت کرے تو وہ چاہے کہیں بھی ہو اور اس کا کسی طبقہ سے بھی تعلق کیوں نہ ہو، وہ اس مقام تک پہنچ سکے جس کا وہ اپنی اہلیت، قابلیت اور محنت کے مطابق حقدار ہو۔ اس پر بھی اگر کوئی کوتاہی کرے تو نتیجہ کی ذمہ داری خود اس پر ہو۔

مثلاً تعلیم حاصل کرنے کا موقع ہر شخص کے لیے فراہم ہونا چاہیے۔تاکہ سب اسکول جاسکیں۔اعلی تعلیم کا موقع بھی سب کے لیے فراہم ہونا چاہیے۔یہ نہ ہو کہ ایک کے لیے تو تعلیم حاصل کرنے کی سہولت ہو اور دوسرے کے لیے نہ ہو۔ایک اعلی تعلیم حاصل کر سکے اور دوسرا نہ کر سکے۔سب کے لیے بطور مساوی اس طرح موقع ہونا چاہیے کہ کسی دور دراز علاقے کے کسان کا بچہ بھی اپنی علمی اور اجتماعی صلاحیت کو بروئے کار لا سکے۔اس کے لیے بھی ایسے وسائل موجود ہوں کہ وہ درجہ بدرجہ ترقی کر سکے مثلاً کسی مضمون میں تخصص کے درجہ تک پہنچ سکے اور اگر اس میں ضروری قابلیت ہو تو وزیر بن جائے۔

بیجا فرق اور امتیاز کا مطلب یہ ہے کہ سب کے لیے کام کرنے کا مساوی موقع موجود نہ ہو۔ایک کے لیے ترقی ممکن ہو اور دوسرے کے لیے نہ ہو۔ایک نیچے رہنے پر مجبور ہو، دوسرے کو اس کی نالائقی کے باوجود ہاتھ پکڑ کر کرسی وزارت اور صدارت پر بٹھا دیا جائے۔

معاشرے کی حالت ایسی نہیں ہونی چاہیے کہ جب کسی وقت افراتفری پیدا ہو تو اس وقت علم وہنر کی قدر معلوم ہو اور اس وقت عقلمند دیہاتی کے بچے وزارت تک پہنچ جائیں کم عقل وزیر کے بچے بھیک مانگنے چل دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ منصفانہ اور متوازن معاشرہ وہی ہے جس میں مساوات کا قانون حکم فرما ہو جس میں

افراد کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جاتا ہو کہ عملاً علمی اور جسمانی مقابلہ ہوتا رہے۔ایسے معاشرے کی ہمیشہ یہ کیفیت ہونی چاہیے کہ دیہاتیوں کے ایسے بچے جن میں اہلیت اور استعداد ہو اعلی ترین منصب تک پہنچ جائیں اور اعلی عہدے داروں کے کم عقل بچے پیچھے رہ جائیں اور ناکام ہوں۔

حسب فرمان رسول اکرمؐ ایسے معاشرے میں ایسے افراد مساوی مواقع کے لحاظ سے کنگھی کے دندانوں کی مانند ہوں اور اعزاز حاصل کرنے کے لحاظ سے آیات کریمہ: **قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون** کا مصداق ہوں۔یہ سب کچھ ایک عام معمول ہونا چاہیے۔

کیا صدر اسلام میں ایسا نہیں ہوا تھا؟ کیا اس آیت کریمہ کا سماں نظروں میں نہیں پھر گیا تھا کہ:

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ

یعنی ہم کو منظور تھا کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو دنیا میں مستضعف یعنی کمزور۔جنہیں علم کے میدان میں پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا اور جن کے حقوق پامال کر دیے گئے تھے ان کو دنیا کا پیشوا اور زمین کا وارث بنا دیں۔(سورہ قصص، آیت 5)

کیا صدر اسلام میں عبداللہ بن مسعود جیسے غلاموں اور غلام زادوں نے عزت ومرتبہ حاصل نہیں کیا تھا؟ کیا ابوجہل، ابولہب، ولید بن مغیرہ جیسی بااثر شخصیتیں خاک میں نہیں مل گئی تھیں؟ کیا خاک نشین اور غلام اپنی لیاقت، تقوی اور نیک اعمال کی بدولت قوم کے سردار نہیں بن گئے تھے؟ اور کیا نالائق اور بد عنوان سرداران قوم ذلت کے گڑھوں میں نہیں گر گئے تھے؟

غیر طبقاتی اسلامی معاشرہ:

یہ مسلم ہے کہ اسلام ایک اجتماعی مذہب ہے۔وہ اس امر کا قائل ہے کہ معاشرے کی اپنی شخصیت ہے۔معاشرہ پیدا ہوتا ہے اور مرتا ہے۔معاشرہ بنتا ہے اور بگڑتا ہے۔اس میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی۔وہ یہ بھی نہیں مانتا ہے کہ معاشرے کا مفاد فرد کے مفاد پر مقدم ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اسلام کے معاشرتی نظام میں افراد کے حقوق اور ان کے واقعی امتیازات کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔اسلام فرد کو شخصی لحاظ سے معارے کے مقابلے میں بے حقیقت نہیں سمجھتا۔بعض دوسرے مفکرین

کی طرح وہ یہ نہیں کہتا کہ فرد بیکار محض ہے۔ جو کچھ ہے معاشرہ ہی ہے۔ حق صرف معاشرے کا ہے۔ فرد کا کوئی حق نہیں۔ مالک معاشرہ ہے، فرد نہیں۔ اہمیت معاشرہ کی ہے، فرد کی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام شخصی حقوق کا قائل ہے۔ فرد کی اہمیت اور آزادی کا قائل ہے۔ وہ اس بات کو انصاف نہیں سمجھتا کہ فرد معاشرے میں گم ہو کر رہے جائے۔ اس کے نزدیک انصاف یہ ہے کہ معاشرے میں مکمل مقابلے کے حالات پیدا کیے جائیں اور اس مقابلے کے نتیجے میں جو کام کی لگن، فرائض کی بجا آوری اور فضیلت وشرف کے میدان میں ہوتا ہے افراد کو خاص حقوق اور امتیازات دیے جائیں۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ اسلام نے ایسے فرق و امتیازات کی جس کا تعلق علم، تقوی، عمل اور جہاد فی سبیل اللہ سے نہ ہو، سختی سے مخالفت کی ہے۔ ایسے امتیاز کو نہ صرف اسلامی احکام میں مزمت کی گئی ہے بلکہ آئمہ اور پیشوایان دین کا عمل بھی اس کے خلاف رہا ہے۔

اسلامی معاشرے کے غیر طبقاتی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاشرہ فرضی اور بے بنیاد امتیازات کا قائل نہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ اس فرق کو بھی زبردستی نظر انداز کر دیتا ہے جس کی اساس، اہلیت، لیاقت اور اکتساب علم و ہنر پر ہو۔

جویبر اور زلفاء:

یمامہ کے ایک شخص نے مدینہ آکر اسلام قبول کیا۔ یہ صاحب اچھے مسلمان بن گئے، اسلامی تعلیم و تربیت حاصل کر لی۔ ان کا نام جویبر تھا۔ پستہ قد، بدشکل اور سیاہ فام آدمی تھے اور ساتھ ہی بہت غریب بھی چونکہ ان کا مدینہ میں کوئی نہیں تھا، اس لیے رات کو مسجد میں سوتے تھے۔ دراصل مسجد کے سوا ان کا کوئی گھر ہی نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے ہی جیسے کچھ دوست بنا لیے یعنی کچھ اور ایسے مسلمان پیدا ہو گئے جو جویبر کی طرح غریب بھی تھے اور پردیسی بھی۔ رسول اللہؐ کی ہدایت کے مطابق یہ لوگ بھی عارضی طور پر مسجد میں رہنے لگے۔

آہستہ آہستہ ان کی تعداد بڑھ گئی۔ اللہ کا حکم آیا کہ مسجد کو پاک اور صاف رکھا جائے۔ مسجد سونے کی جگہ نہیں، علی مرتضیٰؑ اور فاطمہ زہراؑ کے گھر کے سوا جن گھروں کے دروازے مسجد کی طرف کھلتے تھے، وہ سب دروازے بند کر دیئے گئے اور مسجد کی طرف سے گھروں میں آمد و رفت بند کر دی گئی تا کہ مسجد کا

احترام محفوظ رہے۔

رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ ان چند بے گھر غریبوں کیلئے ایک کونے میں ایک سائبان ڈال دیا جائے تا کہ اس کی چھت کے نیچے یہ لوگ رہ سکیں۔ اس جگہ کا نام صُفّہ رکھا گیا اور یہ لوگ اصحاب صُفّہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔

جویبر بھی ان ہی اصحاب صُفّہ میں سے ایک تھے۔ رسول خداؐ اور عام مسلمان ان سے محبت کرتے تھے اور ان کے گزارہ کا انتظام کرتے تھے۔ ایک دن رسول اللہؐ نے جویبر کو دیکھ کر فرمایا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر تم شادی کر لیتے۔ تمہاری جنسی ضرورت بھی پوری ہو جاتی اور بیوی سے دین و دنیا کے کاموں میں مدد بھی ملتی۔

جویبر نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! مجھے بیوی کہاں سے ملے گی؟ میرے پاس حسب ہے نہ نسب، نہ مال اور نہ جمال۔ کون عورت میری بیوی بننا پسند کرے گی؟ آپؐ نے فرمایا:

جویبر! اللہ نے اسلام کے سبب سے قدریں بدل دیں۔ بہت سی چیزیں جو دورِ جاہلیت میں بیش قیمت تھیں کم قیمت رہ گئیں۔ بہت سے لوگ جاہلیت کے غلط نظام میں محترم سمجھے جاتے تھے، اسلام نے ان کی وقعت کم کر دی اور بہت سے لوگ جو جاہلیت میں حقارت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اسلام نے ان کو سربلند کر دیا۔

آج سب لوگ گورے، کالے، قریشی، عربی، عجمی فرزندان آدم ہیں اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔ جویبر! خدا کو سب سے محبوب وہ ہے جو سب سے زیادہ احکام الٰہی پر عمل کرتا ہو۔ کوئی مسلمان وہ مہاجر ہو یا انصاری تم سے بہتر نہیں ہو سکتا مگر تقویٰ کی بدولت۔

پھر فرمایا: جاؤ، زیاد بن لبید انصاری کے گھر جا کر ان سے کہو کہ رسول اللہؐ نے مجھے آپ کے پاس آپ کی لڑکی زلفاء کے رشتہ کیلئے بھیجا ہے۔

جویبر رسولؐ اللہ کے حکم کے بموجب زیاد بن لبید کے گھر گئے۔ زیاد انصاری تھے اور اہل مدینہ میں محترم شمار ہوتے تھے۔ جب جویبر پہنچے تو زیاد کے کئی رشتہ داران کے گھر جمع تھے۔ جویبر اجازت لے کر اندر گئے اور وہاں بیٹھ کر زیاد سے مخاطب ہو کر کہا: میں رسول اللہؐ کی طرف سے ایک پیغام لایا ہوں۔ آپ کہیں تو سب کے سامنے کہہ دوں یا پھر تنہائی میں کہوں؟

زیاد نے کہا: ایسی کیا بات ہے، سب کے سامنے کہو۔

جویبر نے کہا: مجھے رسول اللہؐ نے بھیجا ہے تا کہ میں اپنے لیے آپ کی لڑکی زلفاء کا رشتہ مانگوں۔ اب آپ کیا کہتے ہیں، آپ جو جواب دیں میں رسول اللہؐ سے جا کر کہہ دوں۔

زیاد نے حیرت سے پوچھا: کیا واقعی تمہیں رسول اللہؐ نے رشتہ کیلئے بھیجا ہے؟

جی ہاں: رسول اللہؐ نے بھیجا ہے۔ اب میں رسول اللہؐ پر بہتان باندھنے سے تو رہا۔ جویبر نے جواب دیا۔

زیاد نے کہا: ہمارے یہاں یہ دستور نہیں کہ کسی غیر کو بیٹی دیں۔ ہم تو رشتہ بیاہ اپنے ہم کفو انصاریوں میں ہی کرتے ہیں۔ اچھا تم جاؤ میں خود رسول اللہؐ سے بات کروں گا۔

جویبر باہر آئے تو سوچنے لگے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسلام کے ذریعہ قبیلہ، خاندان اور نسب پر گھمنڈ ختم کر دیا ہے مگر یہ صاحب تو کہہ رہے ہیں ہمارے یہاں دستور نہیں کہ غیر کو بیٹی دیں۔ ان کی بات تو قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔ جب جویبر جا رہے تھے تو لوگوں نے سنا کہ وہ آہستہ سے کہہ رہے تھے۔

واللہ ما بھٰذا انزل القرآن ولا بھٰذا ظھرت نبوّۃ محمد

یہ بات نہ قرآن میں نازل ہوئی ہے اور نہ پیغمبر اسلام اس کیلئے مبعوث ہوئے ہیں۔

چلتے چلتے جب جویبر آپ ہی آپ یہ باتیں کر رہے تھے تو زیاد کی بیٹی زلفاء نے بھی ان کی بات سن لی۔ باپ سے پوچھا قصہ کیا ہے؟

زیاد نے سب قصہ بیان کر دیا۔

بیٹی نے کہا: خدا کی قسم! جویبر جھوٹ نہیں بول رہے۔ کوئی بات ایسی نہ کرو کہ یہ مایوسی کے عالم میں رسول اللہؐ کے پاس پہنچیں، بہتر یہ ہے کہ کسی کو بھیج کر جویبر کو واپس بلوا لو۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، جویبر کو واپس گھر بلا لیا گیا۔

اس کے بعد زیاد خود رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! جویبر آپ کی طرف سے ایسا پیغام لے کر آئے تھے۔ ہمارے یہاں یہ دستور ہے کہ ہم اپنوں ہی میں بیٹی دیتے ہیں۔

رسول اللہؐ نے فرمایا:

زیاد! جویبر مومن ہے اور مومن مرد مومن عورت کا، مسلمان مرد، مسلمان عورت کا کفو ہوتا ہے، اس لیے اپنی بیٹی کی شادی سے انکار نہ کرو۔

زیاد واپس گھر آئے اور سب قصہ بیٹی سے بیان کیا۔

زلفاء نے کہا کہ مجھے منظور ہے۔ جب رسول اللہؐ نے جویبر کو بھیجا ہے تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے؟

زیاد جویبر کا ہاتھ پکڑ کر اپنے رشتہ داروں کے پاس لے گئے، اور سنت کے مطابق اپنی بیٹی کا نکاح اس سیاہ فام سے کر دیا چونکہ جویبر کا اپنا گھر نہیں تھا، زیاد نے ہی ایک مکان کا انتظام کر کے اس کو ضروری سامان سے سجا دیا۔ بیٹی کو جہیز دیا اور وہ اس کو شوہر کے گھر بھجوا دیا۔ دو جوڑے کپڑوں کے جویبر کیلئے بھی تیار کیے۔ جب جویبر اس شان سے دلہن کے کمرے میں پہنچے تو بارگاہ احدیت کی نسبت جس نے ان کو اتنی قدر افزائی کی تھی تشکر و امتنان کے جذبات سے ان کی روح سرشار ہو گئی، شکر و سپاس گزاری کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ وہ گھر کے ایک کونے میں جا کر صبح تک اپنے اللہ سے راز و نیاز اور تشکر اور سپاس گزاری میں مشغول رہے۔ جب دیکھا کہ صبح ہو چکی تھی۔ اس روز شکرانہ کے طور پر روزہ رکھ لیا، تین دن اور تین رات اس روحانی وجد و سرور کی کیفیت میں گزر گئے۔ رفتہ رفتہ دلہن کے میکے والوں کو تشویش پیدا ہوئی کہ کہیں خدانخواستہ ایسا تو نہیں کہ اس شخص کو بیوی کی ضرورت ہی نہ ہو۔

جب اس معاملے کی اطلاع رسول اللہؐ کو دی گئی تو آپؐ نے جویبر کو بلا کر ان سے ماجرا پوچھا۔

جویبر نے کہا: یا رسول اللہؐ! جب میں اس گھر میں گیا اور وہاں کا سامان دیکھا اور یہ دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی بھی موجود ہے اور یہ سب چیزیں میری اپنی ہیں تو مجھے خیال آیا کہ میں تو غریب اور اس شہر میں پردیسی تھا۔ یہ سب اللہ کی دَین اور اس کا فضل ہے جو اس نے اسلام کی وجہ سے مجھ پر کیا ہے اور اس پر میرا دل چاہا کہ میں اس نعمت کا شکر ادا کرنے کیلئے رات عبادت میں گزار دوں، اگلے دن میں نے شکرانہ کا روزہ رکھ لیا۔ تین دن اسی حالت میں گزر گئے۔ رات کو عبادت کرتا تھا اور دن میں روزہ رکھتا تھا، اب البتہ میں اپنی بیوی کے پاس جاؤں گا۔

عدم مساوات کو دور کرنے کی طرف رسول اکرمؐ کی توجہ:

جب ہم رسول اکرم کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان اختلافات کو دور کرنے کی طرف آپ کی خاص توجہ تھی جو رفتہ رفتہ عادت بن گئے تھے اور جن کا تعلق علم و عمل اور فضیلت و سبقت الی الخیرات میں مقابلے سے نہیں تھا۔ یہ صرف عادات تھیں جنہوں نے ناہمواری اور بیجا پستی و بلندی پیدا کر دی تھی۔ آپ کی کوشش تھی کہ اس ناروا فرق کو قطعاً مٹا دیا جائے

مثلاً آپ اس کا خیال رکھتے تھے کہ آپ کی مجلس میں لوگ باہم حلقہ بنا کر بیٹھیں اور کوئی صدر اور پائین مجلس نہ ہو۔ آپ کا حکم تھا کہ مجلس میں آئیں تو جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ۔ اپنے لیے کوئی خاص جگہ مقرر نہ کرواور وہ جگہ حاصل کرنے کے لیے زور نہ لگاؤ۔ جب آپ خود کسی محفل میں تشریف لے جاتے تو آپ کو یہ پسند نہیں تھا کہ لوگ آپ کو دیکھ کر کھڑے ہوں۔ اگر کبھی کھڑے ہونے لگتے تو آپ روک دیتے اور بیٹھے رہنے کا حکم دیتے۔ آپ اس کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے کہ جب آپ سوار ہوں تو کوئی شخص پیدل چلے۔ یا تو اس کو سوار کر لیتے تھے یا کہتے تھے کہ تم آگے جاؤ یا بعد میں آؤ۔ بہرحال اس کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے کہ وہ پیدل آپ کے ہمرکاب چلے۔ آپ خالی زمین پر بیٹھ جاتے تھے اور اپنے ہاتھ سے بکری کا دودھ دوہتے تھے

سیرت نبوی کا اجتماعی پہلو:

ممکن ہے کہ ہم اس سب کو آنحضرت کی فروتنی اور تواضع پر محمول کریں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ میں انتہا درجے کی تواضع تھی آپ ایک لمحے کے لیے بھی اس سے غافل نہیں ہوتے تھے کہ آپ اللہ کے بندے ہیں۔ آپ نے ہمیشہ ذات باری کی عظمت کے بالمقابل اپنے آپ کو ایسا عبد ضعیف سمجھا کہ جس کے ہاتھ میں نہ نفع ہے اور نہ نقصان، جس کو موت پر قابو ہے نہ زندگی پر۔ جس کی یہ حالت ہو ظاہر ہے کہ وہ کس قدر متواضع اور بندگان خدا پر مہربان ہوگا آپ کی تاریخ حیات آپ کی تواضع، فروتنی، مہربانی اور خالق کے سامنے اظہار عبودیت کے واقعات سے پر ہے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ میں سب خوبیاں ہیں مگر ایک کمی ہے کہ آپ رکھ رکھاؤ سے کام نہیں لیتے۔ آپ اپنے آپ سے غلاموں کا سا سلوک کرتے ہیں۔ آپ زمین پر بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا مجھ سے بڑھ کر بندہ اور غلام کون ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کی تواضع اور انکسار کا اخلاقی پہلو بھی تھا۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان معاملات کے اجتماعی پہلو پر بھی پوری توجہ دیتے تھے۔ آپ کو معلوم تھا کہ وہ القاب و آداب اور امتیازات جو بظاہر معمولی بات معلوم ہوتے ہیں، کس طرح افراد کے درمیان ایک دیوار بن کر حائل ہو جاتے ہیں اور دلوں میں بعد پیدا کر دیتے ہیں

ایک سفر میں رسول خدا کے ساتھ ان کے اصحاب بھی تھے۔ دوپہر کو ایک منزل میں قیام ہوا۔ طے پایا کہ ایک بکری ذبح کی جائے اور دوپہر کے کھانے میں اس کا گوشت کھایا جائے۔ ایک صحابی نے کہا کھال اتارنا میرے ذمہ۔ ایک نے کہا کہ گوشت میں پکاؤں گا۔ رسول اللہ نے فرمایا صحرا سے لکڑیاں اکٹھی کر کے لانا میرا کام ہوگا۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ آپ تکلیف نہ کریں۔ آپ آرام کریں ہم بخوشی سب کام کر لیں گے۔ ہم آپ کو زحمت دینا نہیں چاہتے۔ آپ نے فرمایا میں جانتا ہوں تم سب کام کر لو گے لیکن اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا بندہ اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں سے ممتاز خیال کرے۔ رسول اکرم اور آئمہ اطہار کی سیرت میں ایسے معاملات اور قصے بہت ہیں جن سے معلومات ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے تھے کہ اس طرح کی عادات جو ابتدا میں معمولی معلوم ہوتی ہیں اور جن کا نتیجہ حقوق میں بے جا تفاوت کی شکل میں نکلتا ہے ان کی اصلاح کرتے رہیں۔

بات کا خلاصہ:

بات کا خلاصہ یہ ہے کہ عدل و مساوات کے یہ معنی ہیں کہ اس فرق اور امتیاز، ناہمواری اور اونچ نیچ کو مٹا دیا جائے جس کی بنیاد رسم و رواج، عادات یا زور زبردستی پر ہو لیکن اس اختلاف اور تفاوت کو جس کا منشا افراد کی قابلیت، اہلیت اور کارکردگی ہو اس کو باقی رکھا جائے۔ جس طرح مقابلے کے میدان کی سطح کو ہموار رکھا جاتا ہے، اسی طرح سوشل ترقی کے مواقع سب کو برابری کی بنیاد پر فراہم کیے جائیں اور ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ اس مقابلے میں سب کو مساوی طور پر شرکت کا موقع ملے۔

لیکن مقابلے میں ایک اور چیز بھی ہوتی ہے جس کا مقابلے کے میدان اور مقابلے کی شرائط سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق خود مقابلہ کرنے والوں سے ہوتا ہے۔ ایک شخص دوسروں سے پھرتیلا اور مستعد ہے۔ ایک دوسروں کی نسبت دبلا پتلا ہے۔ ایک زیادہ باہمت ہے، ایک زیادہ محنت و کوشش کرتا

ہے۔ایک کی مشق زیادہ ہے۔اس طرح کے فرق بھی مقابلے کے نتیجہ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس فرق کی بنا پر کوئی آگے نکل جاتا ہے اور کوئی پیچھے رہ جاتا ہے۔

سوالات

سوال ۱۔امام علی کی نظر میں مساوات کی تعریف کیا ہے؟

سوال ۲۔معاشرے کی مثال ایک زندہ جسم سے کیسے دی گئی ہے؟

سوال ۳۔انسان کے مدنی الطبع ہونے کا مطلب کیا ہے؟

سوال ۴۔حقیقی مساوات سے کیا مراد ہے؟

سوال ۵۔رسول اکرمؐ نے عدم مساوات کو کیسے زور دیا؟

۲۔مشکلات ومصائب کی اصلیت

اہداف:

۱۔مشکلات ومصائب کی اصلیت کیا ہے؟

۲۔امتحان خداوندی کے کیا معنی ہیں؟

۳۔دشوار فرائض کا فلسفہ کیا ہے؟

جو چیزیں تزکیہ نفس اور تصفیہ اخلاق کی تکمیل میں مدد دیتی ہیں اور ان قوتوں کو بروئے کار لاتی ہیں جو انسانی وجود میں پوشیدہ ہیں ان میں سے ایک مصیبتیں، تکلیفیں اور بلائیں ہیں۔

مصائب، اللہ کی عنایات ہیں:

قرآن وحدیث میں یہ مضمون بار بار ملتا ہے کی اللہ نے فلاں پیغمبر یا اپنے فلاں نیک بندے کو مصیبتوں اور بلاوؤں میں ڈالا یا یہ کہ بلائیں خاص طور پر ان پر آتی ہیں جن پر اللہ کا خاص لطف وکرم ہوتا ہے، یا یہ مضمون کہ مصائب اور مشکلات تحفہ الٰہی ہیں۔مثلاً حدیث میں ہے کہ:

ان اللہ یتعا ھد المومن با لبلاء کما یتعا ھد الرجال اھلہ بالھدیۃ من الغیبۃ

جس طرح پردیس سے کوئی شخص اپنے گھر والوں کو کوئی تحفہ بھیجتا ہے اسی طرح جس بندہ مومن پر اللہ کا کرم ہوتا ہے اللہ اس کے لیے کوئی مصیبت بھیج دیتا ہے۔

یا ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ

ان اللہ اذا احب عبدا غتّہ با لبلاء غتا

اللہ جب کسی کو محبوب رکھتا ہے تو اس کو مشکلات ومصائب میں غوطہ دے دیتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اکرم اس شخص کے ہاں کھانا تناول نہیں فرماتے تھے جو کسی مشکل یا مصیبت میں گرفتار نہ ہوا ہو۔اس بات کو اس کی عدم قابلیت کی علامت اور خدا سے دوری کا نشان سمجھتے تھے۔

اس پر فوراً یہ سوال ہر شخص کے ذہن میں آتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی پر اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم اور اس کی محبت وعنایت کا تقاضا یہ ہو کہ اس کو مصائب ومشکلات میں مبتلا کر دیا جائے۔مہر ومحبت کا اقتضاء تو یہ ہے کہ آرام اور راحت کا سامان فراہم کیا جائے نہ یہ کہ بے آرامی اور تکلیف کا۔

قرآن وسنت میں ایک اور لفظ آیا ہے جس سے ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔یہ امتحان کا لفظ ہے۔اللہ مشکلات ومصائب کے ذریعے اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے۔اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اللہ اس سے ناواقف ہے کہ لوگوں کے دلوں میں کیا ہے جو امتحان لے کر معلوم کرنا چاہتا ہے؟ کیا

قرآن میں یہ تصریح نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی ایک ذرہ بھی ایسا نہیں، کوئی چھوٹی بڑی چیز ایسی نہیں جس کا پورا حال حق تعالیٰ سبحانہ کو معلوم اور اس پر منکشف ہو، پھر امتحان کے کیا معانی ہیں؟

مشکلات کا تعمیری پہلو:

ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت معلوم ہوتا ہے جب مشکلات اور مصائب کا فلسفہ اور آدمی پر ان کا اثر معلوم ہو جائے۔ یہ معلوم ہو جائے کہ قانون فطرت یہ ہے کہ بہت سے کمالات کا حصول اسی وقت ممکن ہے جب سختیوں کا اور مشکلات کا سامنا کیا جائے، حوادث کا مقابلہ کیا جائے اور مصائب پر قابو پانے کی کوشش کی جائے۔ ان کمالات کا حصول سخت تصادم اور ٹکراؤ پر منحصر ہے۔

صرف یہی بات نہیں کہ مشکلات اور تکالیف سے گزرنے کے بعد ہی ہر شخص کے جوہر کھلتے ہیں۔ ہر شخص میں کچھ ایسے جوہر موجود ہیں مگر ایسے چھپے رہتے ہیں جیسے ہیرا مٹی کے نیچے چھپا رہتا ہے۔ یہ جوہر مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ہی ظاہر اور نمایاں ہوتے ہیں۔ صرف یہی بات نہیں بلکہ بات اس سے بڑھ کر ہے۔ مشکلات و مصائب کا اثر انقلاب آفریں ہے۔ مصائب و مشکلات سے کایا پلٹ جاتی ہے۔ مصائب پارس کا پتھر ہیں جو آدمی کو کندن بنا دیتے ہیں۔ ان کے تعمیری اثر سے آدمی کچھ کا کچھ ہوتا ہے۔ کمزور قوی ہو جاتے ہیں، پست ہمت عالی حوصلہ بن جاتے ہیں، خام پختہ ہو جاتا ہے۔ مشکلات کا اثر میل کاٹنا اور زنگ دور کرنا ہے، ابھارنا اور اکسانا ہے۔ ہوشیاری اور احساس پیدا کرنا ہے، کمزوری اور سستی کو دور کرنا ہے۔

اس لیے ان باتوں کو قہر و غضب نہیں بلکہ لطف و کرم سمجھنا چاہیے۔ یہ لطف ہیں قہر کی شکل میں، خیر ہی شر کی صورت میں، نعمت ہی نقمت کے لباس میں۔

جو جوہر قابل ہیں وہ ان الطاف قہر نما سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ صرف موجودہ مشکلات ہی سے فائدہ نہیں اٹھاتے، بلکہ ان کی مثال کسی طالع آزما کی ہے۔ وہ خود مشکلات کی تلاش میں رہتے ہیں اور دانستہ اپنے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔

رومی نے ان عناصر کی جو تکالیف اٹھا کر ترقی اور توانائی حاصل کرتے ہیں ایک مثال بیان کی ہے وہ کہتے ہیں:

ایک جانور جس کا نام اسغر ہے اور جو لکڑی کے زخم کھا کر موٹا اور مضبوط ہوتا ہے۔ جتنا اس کو لکڑی سے مارو، اتنا ہی اس کے لیے اچھا ہے۔ وہ لکڑی کے زخم سے ہی پھلتا پھولتا ہے۔ مومن کی روح کی مثال بھی اسغر کی سی ہے۔ یہ بھی تکالیف اٹھا کر توانا ہوتی ہے اسی لیے انبیاء کو اور سب لوگوں سے زیادہ تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تا کہ ان کی روح اور لوگوں کی نسبت زیادہ توانا ہو جائے۔

رومی نے ایک اور مثال بھی دی ہے۔ یہاں انہوں نے مصیبت جھیلے ہوئے افراد کو رنگے ہوئے چمڑے کی سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں،

جانوروں کی کھال مسالوں کی تکلیف اٹھا کر طائف کا رنگا ہوا چمڑا بن جاتی ہے۔ اگر اس کو تلخ و تیز مسالوں میں خوب کمایا نہ جائے تو سڑ کر بدبو دینے لگتی ہے۔ آدمی کو بھی ایک چمڑا سمجھو۔ وہ بھی رطوبتوں سے خراب ہو جاتا ہے۔ اس کو پاک و صاف اور نرم و نازک بنانے کے لیے تلخ و تیز مسالے ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اللہ کی طرف سے جو بلائیں آتی ہیں وہ تم کو پاکیزہ بنانے ہی کے لیے ہوتی ہیں۔ اللہ کا علم تمہاری تدابیر سے بڑھ کر ہے

یہ تو ہوا پہلے سوال کا جواب کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو بلاؤں میں مبتلا کیوں کرتا ہے۔

امتحان خداوندی:

رہا دوسرا سوال کہ ان صورتوں میں امتحان کے کیا معنی ہیں ؟ میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس میں ایک حد تک اس سوال کا جواب بھی آ گیا ہے۔ بہر حال مزید وضاحت کیے دیتا ہوں۔

کبھی کسی چیز کو اس لیے جانچتے ہیں تا کہ جو بات معلوم نہیں وہ معلوم ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے کسی چیز کو ناپ اور پیمانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا کسی سامان کو ترازو میں رکھتے ہیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ درحقیقت اس کا وزن کتنا ہے۔ ترازو فقط تولنے کا آلہ ہے۔ اس کا کام صرف اتنا ہے کہ یہ بتلا دے کہ کسی چیز کا وزن کتنا ہے۔ ترازو خود کسی چیز میں کمی بیشی نہیں کر سکتی۔ ناپ تول کے تمام پیمانوں کا یہی حال ہے۔ مقیاس الحرارت (تھرمامیٹر) کا کام یہ ہے کہ وہ بتلائے کہ ہوا میں گرمی کتنی ہے یا انسان کے بدن کا درجہ حرارت کیا ہے۔ میٹر ایک مقررہ طول کے ناپنے کا آلہ ہے۔ علم منطق جس کو علم میزان بھی کہا جاتا ہے، اس کا کام یہ ہے کہ استدلال کی شکل کا اندازہ لگائے اور اگر اس مین کوئی خرابی

ہوتو منطقی قواعد کی رو سے اس کا تعین کر دے۔ اگر امتحان کے معنی فقط یہ ہوں کہ نا معلوم کو معلوم کرنے کے لیے کوئی پیمانہ استعمال کیا جائے، جب تو یہ بات خدا کے بارے میں صحیح نہیں ہے۔

لیکن امتحان کے ایک اور بھی معنی ہیں اور وہ ہیں بالقوہ کو بالفعل بنانا اور اس کی تکمیل کرنا۔ اللہ تعالی جو مصائب و مشکلات کے ذریعے امتحان لیتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ جس میں جس کمال کو حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اس کو اس کمال تک پہنچانا۔ مصائب و مشکلات کا فلسفہ یہ نہیں ہے کہ صرف وزن، مقدار اور کیفیت کا تعین کیا جائے بلکہ وزن، مقدار میں اضافہ اور درجہ کو بڑھانا ہے۔ اللہ تعالی اس لیے امتحان نہیں لیتا کہ کسی کی شخصیت کا اندازہ لگائے اور اس کے وزن اور روحانی درجے کا تعین کرے بلکہ وہ اس لیے امتحان لیتا ہے کہ اس شخص کے موجودہ روحانی درجے کو بڑھائے اور اس کے وزن میں اضافہ کرے۔ وہ اس لیے امتحان نہیں لیتا کہ یہ معلوم کرے کہ فی الواقع کون جنتی ہے اور جہنمی، بلکہ مصائب و مشکلات پیدا کر کے اس لیے امتحان لیتا ہے کہ جس میں صلاحیت ہو وہ ان مشکلات کے ذریعے بہشت میں جانے کے قابل ہو جائے اور جس میں صلاحیت نہ ہو وہ اپنی جگہ پر ہی رہے۔

امام علی (ع) اپنے اس خط میں جو والی بصرہ عثمان بن حنیف کے نام لکھا تھا پہلے تو عثمان بن حنیف کو نصیحت کرتے ہیں کہ عیش و عشرت میں نہ پڑیں اور اپنے فرائض سے غافل نہ ہوں، پھر اپنی سادہ اور عیش سے خالی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں خود جو کی روٹی پر قناعت کرتا ہوں اور کسی طرح کے عیش و آرام میں نہیں پڑتا۔ اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ شاید کچھ لوگوں کو اس پر تعجب ہو کہ علی (ع) ایسی خوراک کھا کر کیسے اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ دوسرے دلاوروں کا مقابلہ کر سکیں اور ان سے جیت سکیں؟ قائدے سے تو یہ چاہیے تھا کہ اپنے اس طرز زندگی کی وجہ سے طاقت کھو بیٹھتے اور کمزور ہو جاتے۔ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ جفاکشی کی زندگی میں طاقت نہیں گھٹتی بلکہ طاقت عیش و آرام اور ناز و نعمت کی زندگی سے گھٹتی ہے، آپ فرماتے ہیں:

الا و ان الشجرة البرية اصلب عوداً و الرّوائع الخضرة ارق جلوداً و النباتات البدويه اقوى وقودا

جنگلی درخت جن کی باغبان دیکھ بھال نہیں کرتے ان کی لکڑی زیادہ مظبوط ہوتی ہے اور وہ ہرے بھرے درخت جن کی باغبان پرورش کرتے ہیں نسبتا کمزور رہتے ہیں۔ گھریلو پودوں کی نسبت صحرائی

پودوں کی آگ زیادہ پائدار ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو زمانے کے اچھے برے حالات اور اور نشیب و فراز سے گزرے ہیں اور جنہوں نے سختیاں اور مصائب جھیلے ہیں وہ ان لوگوں کی نسبت جو ناز و نعم میں پلے ہیں زیادہ مظبوط اور طاقتور ہیں۔ فرق ہے اس طاقت سے جو اندر اور باہر سے جوش مارتی ہو اور اس میں جو بیرونی مدد کی محتاج ہو۔ بات تو یہ ہے کہ باطنی استعداد اور غیر محدود باطنی طاقت کا ظہور ہو۔

امام علی (ع) فرماتے ہیں کہ یہ مت کہو کہ یا اللہ میں فتنہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں کیونکہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا نہ پڑے۔ آپ نے فرمایا یہ کہو:

اللهم انی اعوذبک من مضلات الفتن

اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں گمراہ کرنے والے فتنوں سے۔

یعنی پناہ مانگتا ہوں فتنہ کے ان پہلوں سے جو گمراہ کرنے والے ہیں۔

عیش و آرام کی زندگی:

چونکہ مشکلات کا سامنا کرنے سے شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے، مشکلات سے شخصیت جلا پاتی ہے اور کندن بنتی ہے اس لیے مشکلات سے بھاگنے کا اثر الٹا ہوتا ہے اس لیے عقلمندوں نے کہا ہے کہ بچوں کے ساتھ ماں باپ کا حد سے بڑھا ہوا لاڈ پیار ان کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہے۔ یعنی حد سے زیادہ لاڈ پیار اور بچے کو ہر طرح کی مشکل سے دور رکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا اور وہ زندگی کے میدان میں نہتا رہ جاتا ہے۔ ذرا بھی کوئی بات طبیعت کے خلاف ہو تو گھبرا جاتا ہے اور حالات میں ذرا سی تبدیلی اس کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ اس کی حالت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو پانی میں کبھی نہ گیا ہو اور اسے تیرنا نہ آتا ہو۔ ایسے میں اگر دریا کا سامنا ہو جائے اور تیرنا پڑ جائے تو پانی میں اترتے ہی ڈوب جائے گا کیونکہ تیرنا مشق سے آتا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو زبانی یا کتاب سے پڑھ کر اور کمرے میں بیٹھ کر سیکھی جا سکے۔ یہ ایک عملی ہنر ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ پانی میں جا کر مشق اور کوشش کی جائے اور آہستہ آہستہ سیکھا جائے۔

میں نے آغاز سخن میں ایک حدیث پڑھی تھی: **ان اللہ اذا احب عبدا غته بالبلاء غتا**

یعنی اللہ جب اپنے کسی بندے کو پسند کرتا ہے تو اس کو بلاؤں میں غوطہ دیتا ہے۔ غت کے معنی ہیں

غوطہ دینا۔ بلاؤں میں اس لیے غوطہ دیا جاتا ہے تا کہ مشکلات کے سمندر میں تیر کر باہر نکلنا سیکھے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ یہ اللہ کی محبت اور کرم ہے کہ وہ اپنے بندے کو دریائے حوادث سے تیر کر نکلنے کا سامان فراہم کرتا ہے لہذا مشکلات یقیناً اللہ کا لطف ہیں۔

بعض پرندوں کے بارے میں لکھا ہے کہ جب ان کے بچے کے پر نکل آتے ہیں، اس کو اڑنا سکھانے کے لیے پرندہ اس کو اپنے ساتھ لے کر گھونسلے سے نکلتا اور ہوا میں اڑتا ہے۔ پھر ایک دم اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ بچہ کچھ دیر کوشش کرتا ہے، پر پھڑ پھڑاتا ہے اور جب تھک کر زمین میں گرنے لگتا ہے تو اس کی ماں اس کو اپنے بازوں میں اٹھا لیتی ہے۔ چند لمحوں بعد اسے بلندی سے چھوڑ دیتی ہے۔ کچھ دیر یہ بچہ کوشش کرتا رہتا ہے۔ کبھی اوپر اٹھتا ہے کبھی نیچے جاتا ہے جب بالکل تھک جاتا ہے ماں پھر اسے بازوں پر اٹھا لیتی ہے۔ اس طرح کئی بار گرنے کے بعد بچہ پوری طرح اڑنے پر قادر ہو جاتا ہے۔

اسی فطری اصول سے آدمی کے بچے کی تربیت میں کام لیا جانا چاہیے۔ شروع ہی سے بچے کو کام کرنے، محنت کرنے، تکلیف برداشت کرنے اور مشکلات کا سامنا کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ مگر حضرت انسان اس کا الٹ کرتے ہیں۔ اونچا طبقہ یہ سمجھ کر کہ محنت تو غریبوں کا کام ہے محنت سے جی چراتے ہیں اور اپنے بچوں کو بیکار اور مفلوج بنا دیتا ہے۔

ژان ژاک روسو اس طرح کی تربیت کے متعلق اپنی کتاب میں کہتا ہے:

اگر ایسا ہوتا کہ لوگ ساری عمر اس ملک میں رہا کرتے جس میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ اگر پورے سال ایک ہی موسم رہتا، اگر کوئی شخص اپنی تقدیر نہ بدل سکتا، جب تو اس طرح کی تربیت ایک لحاظ سے مفید رہتی لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آدمی کے حالات تیزی سے بدلتے رہتے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس روش سے زیادہ بے معنی اور غلط کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ ہم بچے کی کس طرح تربیت کریں کہ وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے۔ اور ہر وقت نوکروں اور ماماؤں میں گھرا رہے اگر وہ بدنصیب ایک قدم بھی باہر رکھے تو یہ سمجھیں کہ وہ فنا ہو جائے گا۔

یہی روسو کہتا ہے کہ جسم اگر زیادہ آرام میں ہو تو روح میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو شخص درد و رنج سے ناواقف ہو، جو شفقت کی لذت کو نہیں جانتا، جو رحم کی حلاوت سے نا آشنا ہے، اس کا دل کسی چیز سے متاثر نہیں ہوگا۔ اس لیے وہ معاشرتی زندگی کا اہل نہیں ہوگا اور آدمیوں میں دیو بن جائے گا۔

دشوار فرائض کا فلسفہ:

عبادات جن کا مذہب اسلام نے حکم دیا ہے، ایک طرح سے روح کی ورزش ہیں۔ ان کی بجا آوری میں زحمت ہوتی ہے۔ بعض عبادتیں تو واقعی سخت ہیں۔

ان کے منجملہ ایک جہاد ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عبادت عیش و آرام کی زندگی کے منافی ہے۔ رسول اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

من لم یغز و لم یحدث نفسه بغزٍ مات علی شعبة من النفاق

جس نے دین کے لیے جان نہیں لڑائی اور جس کے دل میں اس کی آرزو بھی پیدا نہیں ہوئی وہ ایک طرح کے نفاق میں مرے گا۔

کچھ پردے اور کھوٹ ایسے ہیں جو صرف جہاد، تصادم اور ٹکراؤ ہی سے ہٹائے جا سکتے ہیں اور بعض اخلاق عالیہ کا ظہور میدان جنگ ہی میں ہوتا ہے۔ بہادری اور دلیری کتاب خوانی اور گوشہ نشینی سے پیدا نہیں ہوتی۔

ایک اور عبادت حج ہے جس کو زندگی میں کم از کم ایک بار ادا کرنا ہر صاحب استطاعت پر واجب ہے لیکن اس اجتماعی عبادت کی بجا آوری بھی مشقت اور دشواری سے خالی نہیں۔

امام علی (ع) خانہ کعبہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ خدا کا وہ گھر جس کا طواف ضروری ہے۔ ایک نہایت غیر آباد اور ناہموار جگہ پر واقع ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ بہت ہی سرسبز و شاداب جگہ پر ہوتا جہاں پھلدار درختوں کی کثرت ہوتی اور عمدہ قدرتی مناظر ہوتے لیکن اس وقت نہ امتحان و آزمائش کا موقع ہوتا اور نہ کوئی دشواری اور زحمت اٹھانی پڑتی۔ لوگ سیر کی غرض سے وہاں آتے جو مقدس مقصد ہے وہ حاصل نہ ہوتا۔

آپ فرماتے ہیں، اللہ اپنے بندوں کو طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کر کے آزماتا ہے، ان کو قسم قسم کی مشکلات کا عادی بناتا ہے اور ان کو طرح طرح کے ناخوشگوار واقعات سے دوچار کرتا ہے تا کہ ان کے دلوں سے تکبر نکل جائے اور اس کی جگہ تواضع اور انکسار ان کے دلوں میں گھر کر جائے اور اس طرح ان کے لیے اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جائیں اور ان کی مغفرت کا سامان ہو جائے۔

تنگی اور دشواری:

آخر میں مختصر طور پر ایک اور بات کا تذکرہ کر دوں۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ اگر یہی بات ہے تو پھر یہ جو کہتے ہیں کہ اسلام میں کوئی تنگی اور دشواری نہیں اس کا کیا مطلب ہوا؟

دراصل یہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دین اسلام کے احکام تکلیف دہ نہیں ہیں۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج:78)

اللہ نے دین میں تمہارے لیے کوئی دشواری نہیں رکھی۔

یہ بات نہیں کہ دینی تعلیمات پر عمل انسان کے لیے تکلیف کا باعث ہو لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ اسلام میں تربیت کی بنیاد لاڈ پیار یا عیش اور عشرت پر ہو۔ اسلامی فرائض کی بجا آوری دشوار نہ ہونے اور تکلیف کا سبب نہ ہونے کا مطلب کچھ اور ہے۔

سوالات

سوال ۱۔ مصائب، اللہ کی عنایات کیسے ہیں؟

سوال ۲۔ مشکلات کا تعمیری پہلو کونسا ہے؟

سوال ۳۔ خداوند کے امتحان سے کیا مراد ہے؟

سوال ۴۔ حد سے بڑھا ہوا لاڈ پیار بچے کو کیسے بگاڑتا ہے؟

سوال ۵۔ ژان ژاک روسو نے بچے کی تربیت کے حوالے سے کیا کہا ہے؟

سوال ۶۔ دشوار فرائض کا فلسفہ کیا ہے؟

سوال ۷۔ اسلام میں کوئی تنگی اور دشواری نہیں اس کا کیا مطلب ہے؟